حیاتِ سرمد

★

"عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں۔ ہر عاشق گو قیس نہ ہو مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے اور جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لئے جگہ خالی کر دو۔ سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور جذب و جنون اس طرح چھایا کہ ہوش و حواس کے ساتھ تمام مال و متاع تجارت بھی غارت کر دیا۔ دنیوی تعلقات میں جسم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی، بالآخر اس بوجھ سے پاؤں ہلکا ہو گیا کہ پابندیاں تو مدعیان ہشیاری کے لئے ہیں۔"

ابوالکلام آزاد

تنویر پبلشرز۔ باغ گونگے نواب۔ لکھنؤ

عرضِ ناشر

سرمد کی شہادت کا سانحہ (۱۶۵۹ء) عہد عالمگیری کا ایک یادگار المیہ ہے۔ مولانا ابوالکلامؒ نے یہ خونی داستان اپنے مخصوص انداز میں خواجہ حسن نظامی صاحب کی فرمائش پر اوائل ۱۹۱۰ء میں سپرد قلم کرنا شروع کی، اور اس کی پہلی قسط خواجہ صاحب کے نام کلکتہ روانہ کردی، دوسری قسط دو تین دن کے وقفہ کے بعد خواجہ صاحب کو بھیجی، مگر وہ ضائع ہوگئی، اس کے متعلق مولانا نے واحدی صاحب کو لکھا:۔

"واحدی صاحب تسلیم۔ مضمون قصداً ناتمام بھیجا تھا کہ بیماری اور سفر کی حالت میں جتنے صفحے قلم سے نکلے انہی کو غنیمت سمجھ کر بھیجدینا مناسب نظر آیا، تین دن کے بعد پھر کچھ مہلت ملی تو باقی مضمون مرتب کیا اور وہ بھی خواجہ صاحب کے نام کلکتہ بھیجدیا۔ حیرت ہے کہ اب تک صرف پہلی قسط کیوں بھیجی گئی، بہرکیف اگر ضائع ہوگیا ہو تو اب نہ اتنی مہلت ہے کہ پھر لکھوں اور نہ اس میں اتنی اہمیت ہے کہ دوبارہ وقت صرف کیا جائے، یہ بھی خواجہ صاحب کا اصرار تھا کہ سرمد کے حالات لکھیئے، ورنہ تاریخ کے سیکڑوں ارباب اجتہاد و تجدید شکوہ سنج بے التفاتی ہیں انھیں چھوڑ کر سرمد وغیرہ پر کون وقت ضائع کرے، یاد فرمائی کا شکریہ"۔

لیکن مولانا کو داستان کی ناتمامی کا احساس رہا اور ۳۔ جون ۱۹۱۰ء کو کلکتہ سے خواجہ صاحب کو لکھا۔

"۔۔۔ کہئے تو سرمد کا بقیہ مضمون لکھ بھیجوں۔ بمبئی سے آتے ہوئے سرمد یاد آگئے ان کی رباعیات کا دیوان ساتھ لے لیا تھا۔ کبھی نظر پڑتی ہے تو خیالات موج زن

ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو قلمبند کرکے بھیج دوں"۔

مولانا نے یہ مضمون ۹۔ جولائی ۱۹۱۰ء تک دوبارہ مکمل کرکے بھیج دیا اور پہلی مرتبہ اس نے پوری صحت کے ساتھ اشاعت کا جامہ پہنا، اس کے بعد سے اب تک یہ ناقص حالت میں کئی بار چھپ کر خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کرتا رہا۔ مولانا خود زندگی بھر دار و رسن کا کھیل کھیلتے رہے تھے، بیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں میں اندرون اور بیرون ہند میں جو واقعات پیش آئے انھوں نے سرمد شہیدؒ کو مولانا کے تصور میں اکثر زندہ رکھا ہوگا۔ مولانا کے اسلوب نے اس تصور سے مل کر اس مضمون میں جو کیفیت پیدا کر دی ہے اس کا اندازہ ارباب دل ہی لگا سکتے ہیں، خواجہ حسن نظامی نے غلط نہیں لکھا کہ یہ مقالہ "مقامات درویشی پر ایک مستانہ اور البیلا خطبہ ہے"۔

اب ہم یہ مکمل مقالہ ارباب نظر کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ؎

عمر یست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

سرمد شہیدؒ
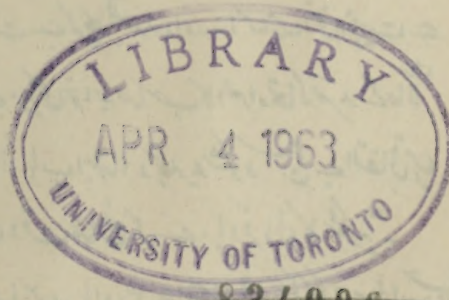
آنانکہ غم تو برگزیدند ہمہ — در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکۂ دو کون فتح از عشق است — با آنکہ سپاہ او شہید اند ہمہ

عہد عالمگیری میں اور اُس کے بعد جس قدر فارسی تذکرے لکھے گئے ہیں، ان میں بالعموم سرمد کے عنوان سے چند سطریں ملتی ہیں لیکن اول تو قدیم تذکروں کے حالات اس قدر مختصر اور ناکافی ہوتے ہیں کہ اگر زندگی میں ان کے نام خطوط لکھے جاتے تو لفافہ کے لئے پورا پتہ بھی نہ میسر آتا۔ اور پھر جو کچھ ہوں، دقت یہ ہے کہ اس وقت سامنے نہیں، میں نے عہد عالمگیری کی تاریخوں کو دیکھا کہ شاید حوادث و واقعات کے ضمن میں کچھ حالات مل جائیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پولٹیکل عاقبت اندیشوں نے قلم کو روک لیا تھا۔ مرزا محمد کاظم نے عالمگیر کے حکم سے تمام سوانح و حالات بقید سنین قلمبند کرنے شروع کئے لیکن صرف دس سال ہی کے حالات لکھے تھے کہ حکماً یہ سلسلہ بند کر دیا گیا، اس کے بعد شاہ عالم کے عہد میں نواب عنایت اللہ کو خیال تکمیل ہوا۔ اس کے اشارے سے مستعد خاں نے بقیہ چالیس سال کے سوانح قلمبند کیے اور ابتدائی دہ سالہ مجموعہ کا انتخاب شامل کر کے مآثر عالمگیری نام رکھا۔ میں نے سنہ ۱۰۷۰ھ کے حالات کی ورق گردانی کی کہ یہی سرمد کی شہادت کا سن ہے، مگر حالات کا ملنا تو ایک طرف، معلوم ہوتا ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ تاریخ کے صفحوں کو بچایا گیا ہے کہ اس شہید عشق کے جامۂ خونچکاں کے قطرہ افشانی سے حاشیہ پر کہیں دھبے نہ پڑ جائیں، لطف یہ کہ اسی سال

شاہ عباس ثانی اور حسین پاشا رومی (غالب والی حجاز) کے سفرا آئے تھے، ان کے حالات کی سطریں صفحے کی انتہا تک پہنچکر بھی آگے بڑھنے سے نہیں رکتیں، خیر یہ حالات بھی کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے تھے، طرّہ بریں یہ کہ اس سال نواح دہلی میں کہیں چند لڑکے شاہ وزیر کی نقل کھیل رہے تھے، ان میں ایک کوتوال اور ایک مجرم بھی تھا، مصنوعی کوتوال نے غیظ و غصّہ میں آکر مصنوعی مجرم کو اصلی سزا دیدی۔ نصف صفحہ کے قریب اس حادثۂ عظیم اور داستان اہم کی نذر کیا گیا۔ مؤرخ کی نظر کا جب یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے قصّوں کے ہجوم میں سرمد بیچارے کی نعش کیونکر نظر آتی۔

خافی خاں کی منتخب اللباب عہد مغلیہ کی مشہور ترین تاریخ ہے جس نے اورنگ زیب کے حالات اس تفصیل سے لکھے ہیں گویا صرف یہی زمانہ موضوع کتاب ہے۔ قیاس کہتا تھا کہ اس نے یہ واقعہ نظرانداز نہ کر دیا ہوگا کیونکہ عالمگیری عہد کا قلم اس کے ہاتھ میں نہ تھا، جس کو ہر قدم پر روک لیے جانے کا اندیشہ ہو، مگر جب اسے کھولا تو ہزار صفحے کے سوانح میں ایک لفظ بھی سرمد کی نسبت نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا راز مؤرخ کا قلم ہے۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی باگ میں کتنی گرہیں ڈال دی گئی تھیں۔

سرمد کی شہادت کا وہی سن ہے جس سن میں کوچ بہار اور آسام پر چڑھائی کی گئی، اس لئے دونوں تاریخوں نے اس سال کے حالات کا نصف حصّہ اسی فتحیابی کی داستان سرائی میں صرف کر دیا، فتح آسام کی اہمیت کے بیان میں شک نہیں، مگر مستعد خاں کو کیا معلوم تھا کہ تماشاگاہ عالم میں ایسی آنکھیں بھی ہیں جو اس شادمانی فتح پر غلط انداز نظر نہ ڈالیں گی مگر اس غم اثر شکست پر ہمیشہ خونچکاں رہیں گی، جو ایک مجنوں لیلائے حقیقت کو دار پر کھینچ کر معرکۂ حق پرستی میں عالمگیر کو نصیب ہوئی۔

قصہ مختصر بایں ہمہ دو کتابیں ایسی پیش نظر ہیں جن سے زیادہ تر معتبر راوی سرمد کے لئے نہیں ہو سکتے، پہلا شخص شیر خاں لودھی (مصنف مرأۃ الخیال) ہے جو بغیر کسی واسطے کے عالمگیری عہد کے واقعات لکھتا ہے، کیونکہ اسی عہد کا تذکرہ نویس ہے، اس کا تذکرہ مرأۃ الخیال میرے پاس ہے۔ دوسرا شخص علی قلی خاں داغستانی عہد محمد شاہ کے امرا میں سے ہے۔ جس نے نہایت تفحص و احتیاط سے شعرائے فارسی کا تذکرہ ریاض الشعرا مرتب کیا، اس کا قلمی نسخہ مصنف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے اور زیادہ تر حالات میں نے اسی سے لئے ہیں، یہ گویا عہد محمد شاہ میں لکھا گیا ہے لیکن سرمد کے حالات کے لئے ایک واسطے سے زیادہ دور نہیں، اس کے علاوہ تمام تذکروں نے جو کچھ لکھا ہے ذہن میں کچھ نہ کچھ تو محفوظ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک بیاض قلمی عہد عالمگیر ثانی کے کسی خوش مذاق شاعر سراج الدین سراج کی جمع کی ہوئی ہے اس میں کہیں کہیں حالات بھی دیے ہیں، غرض کہ گلدستہ تو بنا مگر چند پتوں اور پنکھڑیوں کو دامن میں لے لیا ہے کہ مشہد سرمد میں جاؤں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں۔

سرمد کی قومیت اور مذہب

سرمد کی اصل قومیت اور مذہب کو کوئی صاف نہیں بتلاتا، مصنف مرأۃ الخیال کا بیان ہے کہ ”اصلش از فرنگستان وارمنی بود“۔ مگر باقی تذکرے یہودی الاصل بتاتے ہیں۔ والہ داغستانی اس پر اتنا اور بڑھاتا ہے کہ وطن کاشان تھا مگر یہ اختلاف باہم تناقض نہیں، کیونکہ ایران میں قدیم سے ارمنیوں کی وسیع آبادی موجود ہے جو بالعموم مسیحی اور بعض بعض یہودی ہیں، اب تو انھوں نے یکسر یورپین طرز معاشرت اختیار کر لی ہے اور تحصیل علوم جدیدہ میں تمام ایرانی جماعتوں

سے پیشرو ہیں۔ ایک صدی پیشتر تک ان میں مذہب کے سوا کوئی بات مسلمانوں
سے مختلف نہ تھی، ان میں سے بعض اسلامی علوم و آداب کو اس حد تک حاصل کرتے
تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ صحبتوں میں شریک ہو سکتے تھے، چنانچہ تذکروں میں
متعدد شعراء کے حالات ملتے ہیں جو ارمنی اور مسیحی تھے، مگر ان کے اشعار ایران کے مسلمان خوش گو
شعراء سے کسی طرح کم نہیں، سرمد کا خاندان بھی ارمنی اور یہودی ہو گا۔ کاشان
میں متوطن ہوں گے، ارمنی ہونے کی وجہ سے لوگوں کو خیال پیدا ہوا ہو گا کہ
فرنگی ہے اور ایک باہر کے غیر معروف آدمی کی نسبت ایسا دھوکا ہونا کچھ
عجیب نہیں۔

آفتاب جب چمکتا ہے تو باغ و چمن کو نہیں ڈھونڈتا کہ اپنی
کرنوں کا انھیں نشیمن بناؤں، اس کا فیضان ضو بخش مبدأ فیاض
کی طرح فیض عام ہے۔ محلسرائے شاہی کے کنگروں کے طلائی کلس اگر
اس کی ضو افشانی سے چمک اُٹھتے ہیں تو کیا جنگل کے خشک درختوں کی شاخوں
سنہری رنگ نہیں چڑھ جاتا؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میرا مقصد نظام شمسی کے
مرکز سے نہیں بلکہ آفتاب اسلام سے ہے۔ اس اقیانوس تجلّی کی لہریں اُٹھیں تو
انھوں نے پہلے تو جسم و خون اور قوم و مرز بوم کے قائم کیے ہوئے امتیازات کو
خس و خاشاک کی طرح بہا دیا، پھر سیرابی کا وقت آیا تو احرار قریش اور ارقّائے
حبش، بطحا و یثرب اور عجم و فرنگ، تاجدار غسان اور بادیہ نشین عرب، ادنیٰ و
اعلیٰ، دور و نزدیک سب کو یکساں طور پر شریک فیض کیا، صرف صلاحیت اور
اثر پذیری معیار فیض رسانی تھی کہ ہر قوم اور ہر زمین بقدر صلاحیت حصہ یاب ہوئی،
بوجہل قریشی تھا اور خزانے کے پاس مگر مدت العمر محروم رہا۔ بلال حبشیؓ اور
صہیب رومیؓ تھے، پھر کس قدر دور مگر اُن کے دامن دیکھے تو مالا مال تھے۔

ابرِ کرم کہاں نہیں برستا، مگر ہر زمین لالہ زار نہیں بن جاتی۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

یہ اسی فیاضانہ فیض بخشی کا نتیجہ تھا کہ عرب گو مبداء انتشار اسلام تھا مگر اس کی کوئی خصوصیت نہیں رہی۔ نو مسلم قومیں جو دور دراز ملکوں سے آئی تھیں۔ ہر علم و فن میں اس طرح دست برعلم ہوئیں کہ خود عرب کو ان کے لیے اپنی صفیں توڑ دینی پڑیں۔ یہاں تک کہ آج تراجم و رجال کی کتابیں اٹھا کر دیکھتے ہیں تو کوئی علم و فن ایسا نظر نہیں آتا جس پر نو مسلم قوموں کا تسلط نہ ہو، حتیٰ کہ فقر و تصوف جس کی مذہب کے سائے میں پرورش ہوئی ہے اس کی تاریخ بھی نو مسلم اشخاص کی خود فروشیوں کی منت پذیری سے آزاد نہیں، بات یہ ہے کہ خدا کی محبت کی طرح اسلام کی بے دریغ فیض بخشی بھی اس طرح عام تھی کہ نسب و قومیت کے امتیازات کو اس میں دخل نہ تھا، محرم کی سبیلیں جب لگائی جاتی ہیں تو پیاسوں کی تلاش ہوتی ہے، زریں کلاہوں اور ریشمی قباؤں پر نظر نہیں پڑتی۔ سرچشمۂ فیضانِ الٰہی بھی تشنگانِ محبت کو ڈھونڈتا ہے نسب و قومیت اور رنگ و خاندان سے اُسے کیا سروکار ؟

اس عام فیض بخشی کی ایک نمایاں نظیر سرمد کی سوانح عمری بھی ہے، وہ ایران کے کسی ارمنی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اور مذہبًا یہودی یا مسیحی تھا، آغاز عمر ہی میں فیضانِ الٰہی کی نظر انتخاب پڑی اور جذب ہدایت کی کشش نے مشرف بہ اسلام کیا۔

خاندانی نام

خاندانی نام کا پتہ نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد کیا نام رکھا گیا، عام طور پر صرف سرمد ہی کے لقب سے تذکروں میں ذکر کیا گیا ہے اور یہ یہ ہے کہ سرمد کا بے نام ہو جانا

جائے تعجب نہیں، کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی شرع میں بے نام و نشان رہنا تو
رکن اولین بلکہ شرط ایمان ہے۔

باوجودِ دست ازمن آواز نیامد کہ منم

لیکن بعض تذکروں میں سعید اسے سرمد کے عنوان سے اس کے حالات درج کئے
گئے ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسلامی نام کا ایک جزو شاید لفظ سعید ہوگا،
جو بقاعدہ تخفیف تخلص کے ساتھ مشہور ہوگیا۔

تحصیل علمی

تحصیل علمی کا حال معلوم نہیں، لیکن تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ
علم و فضل اور عربیت میں درجۂ کمال رکھتا تھا، اس سے
قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تحصیل علمی اس زمانے کے نصاب کے مطابق کامل ہوگی۔

ابتدائی پیشہ

ابتدائی پیشہ تجارت تھا، ایران سے تجارتی اموال لے کر
ہندستان کی طرف بڑھا، اس زمانہ میں علم و فن کی طرح جنس و
متاع کی بھی نمائش گاہ ہندستان تھا، مگر یہ جوان تاجر جو بے خبر ہندستان کی
طرف قدم راں تھا، نہیں جانتا تھا کہ وہاں پہنچ کر کس تجارت میں اسے اپنا تمام
سرمایہ لگا دینا پڑے گا، وہ شاید ایرانی مصنوعات فروخت کرکے ہندستان کی
قیمتی اجناس اور محسود عالم کانوں کے لعل و الماس خریدنا چاہتا تھا لیکن اُسے
معلوم نہ تھا کہ قضا و قدر اس کے خلاف فیصلہ کرچکی ہے، تجارت تو اُسے بہرصورت
آخر حیات تک کرنی پڑے گی مگر زخارف مادے کی تجارت گاہوں میں نہیں،
بازار حسن و عشق میں۔ جہاں چاندی سونے کی جگہ دل صدپارہ اور جگر صد زخم
خوردہ کا سکہ رائج ہے، اور جہاں کی تجارت یہ ہے کہ صبر و شکیب، ہوش و
خرد، دل و جگر دے کر ایک غلط انداز نظر، ایک چین جبیں، ایک تغافل پیشہ نگاہ
خرید لیجیے کہ اس سہل قیمت پر یہ متاع مشکل مفت ہے۔

صد ملکِ دل بہ نیم نگہ میتواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

اور صرف اتنا ہی نہیں، کیونکہ یہ تو اس بازار کی نمائش اور سامنے کی چہل پہل ہے، اگر ہمت قدم آگے بڑھائے تو پھر وہ آخری سودا بھی کرنا پڑے گا، جسکی قیمت نقد جان ہے اور جس میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ حیات کا لبریز پیمانہ خونِ شہادت کے ایک لبریز جام سے بدل لیا جاتا ہے اور ثمن کہ جس کے معاوضہ میں اگر یوسف ملے تو کون خیرہ نظر ہے جو اس متاع کا مشتری نہ ہو۔

دو عالم نقد جاں بر دست دارند
ببازارے، کہ سودائے تو باشد

اس زمانے میں ایرانی سیاح عموماً سندھ ہو کر ہندوستان آتے تھے۔ سندھ کے شہروں میں ٹھٹھہ ایک مشہور شہر تھا، جس کو اب نئے جغرافیہ میں گمنامی کا خانہ نصیب ہوا ہے۔ یہی ٹھٹھہ وہ سینائے مقدس تھا جو سرمد کے لئے تجلّی گاہ وادیٔ ایمن بنا، اور لیلائے حسن نے اوّل اوّل اپنے چہرے سے نقاب الٹی، کہتے ہیں کہ ایک ہندو لڑکا تھا، جس کی چشم کافر نے یہ افسوں طرازی کی، اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں کیونکہ عشق و غیرت دونوں کے دو نیم کرنے میں بخیہ گر کی سوئی اور جلاد کی تیغ دونوں برابر ہیں۔

یہاں تجارت میں خریدار عموماً بے پرواہ و بے نیاز مگر اربابِ جنس غرض مند ہوتا ہے، پھر جو لوگ اپنے دلوں کو ہاتھوں پر بطرز نذر رکھے ہوئے خریدار ڈھونڈھتے ہوں، انھیں تو حق ہی نہیں کہ خریدار میں خاص اوصاف کے طالب ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادہ لوح ایرانی تاجر بھی متاعِ دل کی کس مپرسی سے تنگ آگیا تھا اور خود خریدار کو بے تابانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ جب خریدار مل گیا تو نظر اٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ کون ہے اور کیا لے کے آیا ہے، اسی کو غنیمت سمجھا کہ دل جیسی متاع ارزاں

کی ایک چشمِ سحر کار طالب ہے اور بلا تامل یہ سودا منظور کر لیا۔

دلالِ عشق بود و خریدار جانستاں
خود فروختیم چہ سودا بکار رسید

سرمد کو آئندہ جس صحرا میں بادیہ پیمائی کرنی تھی یہ اس کی طرف پہلا قدم تھا، اور کچھ سرمد ہی کی خصوصیت نہیں، عشق خواہ کسی عنوان ہو منزلِ حقیقت کا ہمیشہ سے پہلا قدم ہے بلکہ یہ کہنا بھی تنزل ہے، منزلِ حقیقت کا کیا ذکر، عشق تو وہ دروازہ ہے جس سے گزرے بغیر انسان انسان نہیں ہو سکتا، جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں میں تری نہیں، اس کو معنیِ انسانیت سے کیا واسطہ؟ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ زاہد خشک بھی باایں ہمہ تعصب و تقشف۔ جب اپنے زاویۂ عبادت میں سر بزانو ہوتا ہے تو حور و غلمان کی مسکراہٹوں سے لطف لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ صوفی جو سنسان ویرانوں میں گوشوں اور حجروں میں دوست کو ڈھونڈتے ہیں انہیں بھی اس تصور کے بغیر چارہ نہیں ؎

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہِ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

یہی وجہ ہے کہ جو سوداز دگانِ حقیقت شاہدِ ازلی کے جمال دادہ ہیں، انہیں بھی مجازی کوچوں میں در و دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا گیا ہے۔ کیونکہ دل جب تک لذتِ آشنائے درد نہ ہو برف کا ایک ٹکڑا ہے جس کو پانی بنتے دیکھا ہے مگر برف آگ میں جلتے ہوئے کبھی نظر نہ آئی، حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے۔ اور عشق کا کلیسا آتشکدہ ہے۔ یہاں وہی آتشِ طلب قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنے دلوں کو اس آتشکدہ پر نذر چڑھا دیں اور پھر دامن سے ہوا بھی دیتے جائیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے ؎

افسردہ را نصیب نباشد دلِ کباب
آں یابد ایں نوالہ کہ مہماں آتش است

عشقِ الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسوا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں مگر
انسان آب و گل کے تعلقات میں اس طرح پابہ گل ہے کہ جب تک دل پر درد کو
کوئی محکم چوٹ نہ لگے ادھر سے ٹوٹ نہیں سکتا، مکھی جب شہد پر بیٹھ جاتی ہے
تو جب تک اُڑائیے نہیں، نہیں اُڑتی۔ انسان کا دل بھی جب تک چوٹ نہ کھائے
دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے۔
عشق کا فرشتہ اپنے بازوؤں میں وہ مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے کہ اس کی
تیغ کا پہلا ہی وار خون کے تاروں سے بندھے ہوئے رشتوں اور دنیا کی
دل فریبیوں کی جکڑی ہوئی زنجیروں کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے اور دل جب ہر
قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو حلقۂ ازل کے سوا
اور کوئی بیڑی پاؤں میں نہیں ہوتی۔ اسی درد کے لئے عارف عطار بے قرارانہ
فغاں ساز ہے کہ ؎

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرۂ دردے دلِ عطار را

غور کرو جس مُردہ دل کو کبھی یہ وقت خوش نصیب نہ ہوا کہ کسی بند نقاب کے ٹوٹنے
کے تصور میں اپنے خرمنِ ہوش و حواس پر بجلیاں گرائے اس کو شاہدِ حقیقت کا
نظارہ جو حواسِ ظاہری سے کب کھل سکتا ہے؟ جب افسردہ تنفس نے اپنی نغز
اور شیریں باتیں کسی نرگسِ خواب آلود کی یاد میں نہ کاٹی ہوں۔ اس کو معشوقِ
حقیقی کی یاد میں بے چین راتیں کب نصیب ہوں گی؟ جس خیرہ دماغ نے اپنے
سرمایۂ عجز و نیاز کو کسی مغرور ناز کی کج ادائیوں اور بے نیازیوں پر نثار نہ کر دیا ہو
وہ خود پسندی اور خود آرائی کے بُت کو کیوں کر توڑ سکتا ہے؟ جس بے حس کو کسی
پیکرِ حسن کی صدائے شیریں نے مبہوت اور لایعقل نہ کر دیا ہو اس کو سازِ ازلی کی

نغمہ سرائی پر کیوں کر وجد آئے، غرض کہ جس بد نصیب کو کسی مست حسن کی نگاہ بے محابا بیخود نہ کر سکی اُسے جلوۂ طور پر کیوں غش آنے لگا ؟ جو فتیلہ پہلے جل چکا ہو وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے۔ لیکن نئے فتیلہ کو بہت دیر تک آگ دکھلانی پڑتی ہے۔

محبت با دل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد
چراغے را کہ دودے ہست در سر زود تر گیرد

نظریں اگر جویائے حسن ہیں تو روئے پنہاں کے نظارے کی کیوں منتظر ہیں۔ انہیں تو پردۂ نقاب کی زیبائی ہی پر لوٹ جانا چاہیئے کنعان کی گم کردہ پسر آنکھوں نے جلوۂ یوسفی کا انتظار نہیں کیا۔ پیراہن یوسفی کی بو پاتے ہی کھل گئیں۔ کہ اِنِّی لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنَ یہی وجہ ہے کہ میخانہ حقیقت میں جب محلس گرم ہوتی ہے تو پہلے جام و مینا کا دور چلتا ہے اور جب اس کے تلخ گھونٹ گوارہ ہو جاتے ہیں، تو پھر ساقی اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دیتا ہے کہ اب جام و سبو کی ضرورت نہیں، اسکی نگاہ سحر خیز سے خود رفتگی و خود گزشتگی حاصل کیجئے

مے حاجت نیست مستیم را
در چشم تو تا خمار باشد

سرمد کے آگے بھی یہ جام رکھا گیا اور جام کی خوبی بہت کچھ جام پیش کرنے والے ہاتھ کی رعنائی پر منحصر ہے۔ اس لئے ہم اس ہندو لڑکے کو بھولنا نہیں چاہتے جس کی نگاہ لیلیٰ روش نے سرمد کو مجنوں بنایا۔ مگر افسوس کہ ہر عاشق قیس و فرہاد کی قسمت کہاں سے لائے؟ سرمد کے لیلے کا زیادہ سے زیادہ حال جو معلوم ہوتا ہے یہی ہے کہ ایک ہندو لڑکا تھا اور غور کیجیے تو یہ بھی بہت ہے۔ کیونکہ بازار عشق میں جب سودا چکایا جاتا ہے، تو یہ کب دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے اور کیسا

قیمت مل رہی ہے؟ ؎

مرا فروخت محبت ولے نمی دانم
کہ مشتری چہ کس ست و بہائے ما چند ست

ارباب تذکرہ اس میں بھی ہم آہنگ نہیں کہ یہ واقعہ کہاں ہوا۔ والہ داغستانی لکھتا ہے کہ بندر سورت میں۔ اور آزاد بلگرامی نے اپنے کسی تذکرے میں عظیم آباد پٹنہ لکھا ہے لیکن ان سب میں مراۃ الخیال قدیم العہد ہے اور اس کا بیان ہے کہ "در اثنائے تجارت بشہر ٹتہ اُفتاد۔ بہ ہندو پسرے عاشق گشت" اس لئے ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ بہرکیف بجلی کہیں گری ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ دہقان کے خرمن سوختہ کا کیا حال ہوا۔؟

عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں۔ ہر عاشق گو قیس نہ ہو مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے اور جب عشق آتا ہے تو عقل وخرد اس سے کہتا ہے کہ میرے لئے جگہ خالی کر دو۔ سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور جذب وجنوں اس طرح چھایا کہ ہوش وحواس کے ساتھ تمام مال و متاع تجارت بھی غارت کر دیا۔ دنیوی تعلقات میں سے جسم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی، بالآخر اس بوجھ سے بھی پاؤں ہلکا ہو گیا کہ پابندیاں تو مدعیان ہوشیاری کے لئے ہیں مجنون لا یعقل مرفوع القلم ہوتے ہیں ؎

خطا بہر دم دیوانہ کس نمی گیرد
جنوں نداری و آشفتہ خطا اینجاست

بیاباں نوردی بیاباں نوردی عالم عشق کی سیر و سیاحت ہے کہ اسی سے انسان کی عقل، تجربہ کار و پختہ ہوتی ہے۔ "مجنوں جو وصف عشاق میں نمایاں نظر آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ صحرا گردی میں کوئی حریف نہیں۔ سرمد نے

بھی مدتوں صحرا کی خاک چھانی، سندھ کے ریگ زاروں سے تلوے گرم کیے۔ ہندوستان کے گرم و سرد موسموں کو یکساں عریانی میں کاٹ دیا۔ اور بالآخر جب یہ عقدہ کھلا کہ ؎

بیہودہ چہ سرا در طلبش میگردی
بنشیں! اگر او خدا است خود می آید (سرمد)

تو پھر ایک مستقر کی تلاش ہوئی، جہاں بیٹھ کر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کیا جائے لیکن جب نتیجہ یہی تھا تو پھر یہ بیاباں نوردی کیوں تھی؟ مگر نہیں خود کہہ چکا ہوں کہ یہ بھی عشق کے قانون کمال میں داخل ہے اور عشق کے قانون میں استثنا نہیں ؎

یکے از دستگیر ہائے عشق است
عزیزاں را بخواری بر کشیدن

یہ وہ زمانہ تھا کہ عنقریب بساط ہند پر عالمگیرؒ ایک نئی چال چلنے والا تھا اور شاہجہانی حکومت کا عہد آخری اور شاہزادہ دارا شکوہ ولیعہد سلطنت تھا، سلسلۂ مغلیہ میں دارا شکوہ ایک عجیب طبیعت و دماغ کا شخص گزرا ہے، اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیئے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا، اس لئے اصلی تصویر پولٹیکل چالوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی، وہ ابتدا سے درویش دوست اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقرا اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا، اسکی بعض تحریرات جو دست برد حوادث سے بچ گئی ہیں بتلاتی ہیں کہ انکا لکھنے والا بھی ذوق و کیفیت سے خالی نہیں، اس کے صاحب ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی اور جب نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقرا کے آگے سر جھکاتا تھا۔ ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں سے بھی رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اس

عالم میں کبھی کفر و اسلام کی تمیز ہو تو پھر اعمیٰ اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا؟ پروانہ کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہیئے۔ اگر صرف شمع حرم ہی کا شیدا ہے تو سوز طلبی میں کامل نہیں ؎

عاشق ہم از اسلام خرابست وہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر ندانند

سرمد جوش جنوں میں پھرتا ہوا جب **شاہجہان آباد دھلی** پہنچا تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لے جائیں کیونکہ جس جام کی تلاش ہے وہ اسی میخانہ میں ملے گا۔ مصنف مراۃ الخیال جو عالمگیر پرستی کے معبد میں صف اولین کا طالب ہے لکھتا ہے :-

"چوں خاطر سلطان داراشکوہ بجانب مجانین میل داشت صحبت بوسے درگرفت"۔

بیچارا علی شیر[1] بھی ہوشیاری و دیوانگی ہی کی بحث میں سرشار رہا ہے، اسے کیا خبر کہ دنیا میں ایسے ترازو بھی ہیں جن کے ایک پلے میں اگر دیوانگی رکھ دی جائے تو دوسرا پلہ تمام عالم کی ہوشیاری رکھ دینے سے بھی نہیں جھک سکتا۔ اور پھر ایسے خریدار بھی ہیں جن کو اگر ہوش و حواس کا تمام سرمایہ دے دینے سے ایک ذرہ جنون مل سکتا ہو تو بازار یوسف کی طرح ہر طرف سے ہجوم کریں۔ بہرکیف خواہ کچھ ہو۔ عالمگیر کی ہوشیاری سے تو ہمیں داراشکوہ کی دیوانگی اور جنون دوستی پسند آتی ہے کہ وہاں تو تیغ ہوشیاری کشتگان حسرت کے خون سے رنگین ہے اور یہاں خود اپنے جسم کے رگہائے گردن سے خون کی نالیاں بہہ رہی ہیں۔ شاید داراشکوہ بھی عالمگیر جیسے ہوشیاروں کی ہوشیاری سے تنگ آگیا تھا۔ اسی لئے اُس نے سرمد جیسے مجانین کی

(۱) مصنف مراۃ الخیال

صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی۔

غرضکہ سرمد دارا شکوہ کی صحبت میں رہنے لگا اور اُسے بھی سرمد سے کمال عقیدت تھی۔ اس زمانہ میں عشق کی شورش انگیزیاں کبھی کبھی اسے باہر نکلنے پر مجبور کرتیں لیکن چونکہ معلوم ہو چکا تھا کہ آخری امتحان گاہ یہی ہے، اس لئے شاہجہان آباد سے نکل نہیں سکتا تھا یہاں تک کہ شاہجہاں کی علالت اور دارا شکوہ کی نیابت نے عالمگیری ارادوں کے ظہور کا سامان کر دیا۔ اور ایک عرصہ کی شورش و خونریزی کے بعد ۱۰۶۹ھ میں عالمگیر اورنگ زیب تخت نشین حکومت ہوا۔ یہ زمانہ دارا شکوہ کے ساتھیوں اور ہم نشینوں کے لئے خود دارا شکوہ سے کم مصیبت انگیز نہ تھا۔ بہت سے لوگ تو دارا شکوہ کے ساتھ نکل گئے اور جو رہ گئے انھوں نے اپنے آپ کو کشتی طوفان میں پایا۔ لیکن اس رہین بے خبری کو اپنے استغراق میں اس کی فرصت کہاں ملتی تھی کہ دنیا کو نظر اُٹھا کے دیکھے اور اگر دیکھتا بھی تو وہاں سے کیوں کر نکلتا۔ کیونکہ بایں ہمہ بے خبری اس سے بے خبر نہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے عشق کی ابتدائی منزلیں تھیں، آخری منزل طے کرنی باقی ہے اور وہ یہیں پیش آنے والی ہے۔

بیک دو زخم کہ خوردن ز عشق امن مباش
کہ در کمیں گہہ ابرو کمان کش ست ہنوز

سرمد کی شہادت

سرمد کی شہادت کے اسباب تذکرہ نویسوں نے مختلف بتلائے ہیں۔ تذکرۃ الخیال میں ہے کہ سرمد کی اس رباعی پر جبہ پوشان شرع کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے اسے کفر قرار دیا کہ معراج جسمانی سے انکار لازم آتا ہے

ہر کس کہ سر حقیقتش باور شد | او پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر فلک شد احمد | سرمد گوید فلک بہ احمد در شد

مگر اس ترک سادہ کو فقیہانہ جنگ و جدل سے کیا سروکار تھا۔ اس نے نظر اُٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ یہ کور بصر کیا شور و غوغا کر رہے ہیں؟ وہ تو اس عالم میں تھا جہاں ان اقرار و انکار کی بحثوں کی آواز بھی نہیں پہونچ سکتی ؎

در عجائبہائے طور عشق حکمتہا کم ست

عقل را با مصلحت اندیشیٔ مجنوں چہ کار

لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیرؒ کی نظروں میں تو سرمد کا سب سے بڑا جرم داراشکوہ کی معیت تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پالٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خونریزیاں جو پولٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں انھیں مذہب کی چادر اُڑھا کر چھپایا گیا ہے۔ جب کوئی اور بہانہ نہ ملا تو عُریانی و برہنگی کو کہ خلاف رسم شرع ہے بنیاد قرار دیا اور مذکورہ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراج جسمانی کا منکر ہے۔ مُلّا قوی اس زمانہ میں قاضی القضاۃ تھے عالمگیرؒ نے اُنھیں سرمد کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں، مُلّا صاحب نے کہا کہ باوجود کمال علم و فضل برہنہ و مکشوف العورہ رہنا کس عذر پر مبنی ہے۔ سرمد نے کہا کیا کروں شیطان قوی ہے اور فی البدیہ یہ رباعی پڑھی۔

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا	چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من ست و من در طلبش	دزدے عجبے برہنہ کردہ است مرا

مُلّا صاحب برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات ہی تھی، کیونکہ اسلام کی توہین نہیں کی گئی مگر خود اُن کے وجود اسلام عبارت کی سخت اہانت ہوئی یعنی اُن کا اسم سامی ابلیس لعین کا وصف قرار پایا۔ بہرکیف انھوں نے عالمگیرؒ سے آکر کہا کہ کفر کا کافی مواد ہاتھ آگیا ہے اور قلمدان کھولنا چاہا کہ علمائے ظاہر کی تیغ خوں آشام ابھی نیام میں رہتی ہے لیکن عالمگیر کی عاقبت اندیشیوں نے صرف اس بہانے کو کافی نہ سمجھا، وہ

خوب سمجھتا تھا کہ سرمدؔ کوئی معمولی شخص نہیں ہے جس کا قتل ایک عامۃ الورود واقعہ سمجھا جائے گا، علم وفضل کے لحاظ سے کوئی اس کا ہمتا نہیں اور رجوع خلائق کا یہ حال ہے کہ سارا شاہجہان آباد اس کا معتقد اور ہوا خواہ ہے، اس لئے جب تک کوئی بہانہ قوی ہاتھ نہ آئے اس ارادے کو ملتوی رکھنا چاہیئے۔

اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصہ میں فقہاء کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان کے فتووں کا دامنگیر ہے۔ اسلام کی تاریخ کو کہیں سے پڑھو سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ بادشاہ جب خونریزی پر آتا تھا تو دارالافتار کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے۔ صوفیہ اور ارباب وطن پر منحصر نہیں، علماے شریعت میں سے بھی جو نکتہ بیں اسرار حقیقت کے قریب ہوئے فقہاء کے ہاتھوں انھیں مصیبتیں اُٹھانی پڑیں اور بالآخر سر دے کر نجات پائی، سرمدؔ بھی اسی تیغ کا شہید ہے ؎

چوں میسرود نظیری خونیں کفن بحشر
خلقے فغاں کنند کہ ایں داد خواہ کیست

آخر الامر یہ قرار پایا کہ سرمدؔ کو علماء وفضلائے عصر کے مجمع میں طلب کیا جائے اور تمام علماء کی جو رائے قائم ہو اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ مجلس منعقد ہوئی اور سرمدؔ کو بلایا گیا۔ سب سے پہلے خود عالمگیر مخاطب ہوا اور پوچھا لوگ کہتے ہیں کہ سرمدؔ نے دارا شکوہ کو مژدۂ سلطنت دیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟ سرمدؔ نے کہا۔ ہاں اور وہ مژدہ درست نکلا کہ اُسے ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ عمامہ بندوں نے کہا کہ برہنگی شرع کے خلاف ہے اور اس کے لئے صاحب عقل وتمیز کا کوئی عذر مسموع نہیں۔ اس کا جواب تو سرمدؔ پہلے ہی دے چکا تھا۔

"دزدے بججے برہنہ کردہ است مرا"

خلیفہ ابراہیم بدخشانی اواخر عہد عالمگیری میں ایک صاحب طریقت بزرگ گزرے ہیں جو ابتدائے جوانی میں سپاہی پیشہ تھے اور فتح اللہ خاں کے ہاں کہ امرائے عالمگیری میں سے تھا نوکر ہو گئے تھے۔ اتفاقاً میر جلال الدین بدخشانی نامی ایک صاحب حال بزرگ کی اُن پر نظر پڑ گئی اور ان کو فیض پذیر دیکھ کر اپنی تربیت میں لے لیا۔ رفتہ رفتہ یہ خود بھی صاحب حال ہو گئے، علم ظاہری کی تحصیل کا گو موقع نہ ملا لیکن مذاق فطری کا یہ حال تھا کہ مثنوی معنوی کا دفتر ہفتم چار حصوں میں نظم کیا جو درد و کیفیت سے لبریز ہے۔ معز الدین جہاندار شاہ کو ان کی خدمت میں کمال اعتقاد تھا اور ہندوستان و دکن میں ہزاروں اشخاص ان کے معتقد و حلقہ بگوش تھے۔

والہ داغستانی انھیں بزرگ سے روایت کرتا ہے کہ جب مجمع علماء میں سرمد کو لباس پہننے کے لئے کہا گیا اور مسموع نہ ہوا تو بادشاہ نے علماء سے کہا کہ محض برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔ اس سے کہا جائے کہ کلمہ طیبہ پڑھے اور یہ اس لئے کہا کہ بادشاہ سُن چکا تھا کہ سرمد کی عادات عجیبہ میں سے ایک یہ عادت بھی ہے کہ کلمہ طیبہ جب پڑھتا ہے تو لا الٰہ سے زیادہ نہیں کہتا، علماء نے سرمد سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب صرف لا الٰہ پڑھا کہ جملہ نفی ہے۔ اس پر علماء نے شور مچایا تو کہا " ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں۔ مرتبۂ اثبات تک نہیں پہنچا۔ اگر الا اللہ کہوں گا تو جھوٹ ہوگا اور جو دل میں نہ ہو وہ زبان پر کیسے آئے؟

علماء نے کہا ایسا کہنا کفر صریح ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو مستحق قتل ہے یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمد اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر و ایمان کی بحثیں سُنائی جائیں اور وہ قتل و خون کے احکام سے مرعوب ہو۔ کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر سوچتے تھے کہ اس کی کرسی کتنی اونچی ہے، اور وہ اس منارۂ عشق پر تھا جہاں کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں اور جہاں

کفر و ایمان کے عَلَم ایک ساتھ لہراتے ہیں

کشور بے ہست کہ در وے رود از کفر سخن

ہمہ جا گفت و شنو بر سرِ ایماں نہ رود

اور سرمد نے تو اپنی اصلی حالت بے کم و کاست بیان کر دی تھی۔ ایمان بالغیب پر جو لوگ قانع نہیں ہوتے اور اس عدم قناعت ہی کا نام تلاش حقیقت ہے وہ اپنے اقرار کو مشاہدہ عینی سے استوار کرنا چاہتے ہیں اور شاہد حقیقت کی رونمائی نقد شہادت ہے جو ابھی سرمد کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس جس چیز کو دیکھا نہ تھا کیونکر کہہ دیتا کہ "ہے" اس ملک کے جتنے رہرو ہیں سب ہی کو اس منزل سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن سرمد کا جرم یہ تھا کہ وہ جس جام کو چھپ کر پیتے ہیں سرمد نے علانیہ منھ سے لگایا اور درّۂ محتسب کا مستحق ٹھہرا۔

خرقہ پوشاں ہمہ گرمست گزشتند گزشت

قصہ ما ست کہ در کوچہ و بازار بماند

اور نظر تعمق سے دیکھیے تو یہ اعلان ضروری تھا کیونکہ جب اس سفر کی آخری منزل شہادت تھی تو خواہ ناقہ کا رخ کسی طرف ہوتا دست کارفرما کا فرض تھا کہ اسی طرف پھیر دے ؎

منصور را کہ رخصت اظہار دادہ اند

غیر از قصاص و محنت زنداں نبودہ شرط

غرضکہ جب سرمد نے توبہ نہ کی تو علما نے بلا تامل فتوائے قتل صادر کیا اور دوسرے دن قتل گاہ میں لے گئے۔ بموجب بیان مراۃ الخیال یہ واقعہ ۱۰۷۲ھ میں ہوا کہ عالمگیرؒ کی تخت نشینی کو تین سال سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا ؎

مو بمویم دوست شد ترسم کہ از استیلائے عشق

یک انا الحق گوئے دیگر بر سر دار آورد

شاہ اسد اللہ نامی ایک مرد درویش وحق آگاہ راوی ہیں کہ :-

"مجھے سرمد کی خدمت میں کمال خصوصیت حاصل تھی۔ جب شورش ہنگامہ شروع ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک دن موقع پا کر عرض کیا کہ اگر اپنی وضع وحالت بدل دیں تو بندگان الٰہی کی منت وسماجت دیکھتے ہوئے بظاہر کوئی نقصان نہیں"۔ یہ سن کر نظر اٹھائی اور اپنا یہ شعر پڑھ دیا

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد

من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

جب سرمد کو شہادت گاہ لے چلے تو بیان کیا جاتا ہے کہ تمام شہر ٹوٹ پڑا تھا اور ایسا ہجوم تھا کہ راہ چلنا دشوار ہو گیا تھا، عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہئے۔ جہاں کا عام پسند تماشا خوں ریزی ہے۔ جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دلپسند کھیل نہیں، جب کوئی سر دادہ سر بکف بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے دولھا کی سواری جا رہی ہے اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے ؎

بجرم عشق توام میکشند وغوغائیست

تو نیز بر سر بام آ۔ کہ خوش تماشائیست

مگر یہ عشق مجازی تھا کہ سر بام آنے کی خواہش کی گئی۔ ورنہ سرمد کو سر اٹھانے کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔ جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو مسکرا کے نظر ملائی اور کہا :-

"فدائے تو شوم۔ بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم"۔

صاحب مراۃ الخیال راوی ہے کہ اس جملے کے کہنے کے بعد یہ شعر پڑھا اور مردانہ وار تلوار کے نیچے سر رکھ کر جان دیدی

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

صاحب مراۃ الخیال کو عالمگیرؒ کی خوشامد سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ سرمد کی نعش خون آلود پر اشک افشانی کرتا۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اس سنگین دلی پر قانع نہ ہو کر چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ خونریزی بھی عالمگیر کے دفتر مناقب و فضائل میں جگہ پائے حالانکہ اس دفتر میں تو پہلے ہی سے ہر صفحہ رنگین ہے۔ اس کو بھی عشق ہی کی شیوہ گری سمجھئے کہ یہاں کی قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلود ہوتے ہیں وہ مجرم و خونی ہونے کی جگہ تحسین و ثواب کا صلہ مانگتے ہیں۔ گویا میدان عشق بھی قربان گاہ مِنا ہے کہ جس قدر بھی خون بہائیے عین ثواب ہے۔

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمد کی جہاں قبر سمجھی جاتی ہے یہ اس کا مدفن نہیں، صرف مشہد ہے۔ لیکن والہ داغستانی نے تصریح کر دی ہے کہ

"در جنب مسجد جامع گردن او را زدند و در ہماں جا دفن کردند"۔

یہ مقام موجودہ مقام مزار کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے؟ پھر لکھتے ہیں کہ

"راقم حروف بہ زیارت مزار وے مکرر مشرف شدہ اہم در چہار فصل سبزہ از تربتش کم نہ می شود۔ والحق فیض عجیبے و زیارت آں منصور ثانی ہست"۔

والہ داغستانی عہد محمد شاہی میں تھا اور اس کے تذکرے کا سال تصنیف ۱۱۶۰ھ ہے۔ لیکن آج بھی مشہد سرمد زیارت گاہ عوام و خواص ہے اور ہمیشہ فاتحہ کے ہاتھ اس کے آگے رو بہ آسماں رہتے ہیں۔

بہ سر تربت حافظ چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

خلیفہ ابراہیم جن کے حالات اوپر گذر چکے ہیں۔ راوی ہیں کہ سرمد نے زندگی میں کلمہ طیبہ "لا الٰہ"

سے زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن جب شہادت پائی تو لوگوں نے سُنا کہ سرِ کُشتہ سے تین بار "اِلّا اللہ" کی صدا بلند ہوئی۔ اس کے علاوہ والہ داغستانی لکھتے ہیں کہ:-

"ایک ثقہ جماعت سے سُنا گیا ہے کہ سرمد کا سرِ مقتول کلمہ طیبہ پڑھتا رہا اور اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ دیر مصروف حمد الٰہی بھی رہا۔"

موجودہ زمانے میں ایسی روایتوں پر لوگ مشکل یقین لائیں گے اور سوانح نگار کا فرض ہے کہ خوش اعتقادی کی روایات اور تاریخ کو الگ الگ رکھے، لیکن ہمیں تو یہ بیان پڑھ کر کچھ بھی تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں ہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں سے بھی محروم ہو جانا چاہیئے؟ ہم نے بہار میں شگفتہ و شاداب پھولوں اور خزاں میں افسردہ اور خشک شاخوں کو باتیں کرتے دیکھا ہے۔ پھر اگر ایک شہید عشق کے سرِ مقتول کے لب ہلتے نظر آئیں تو کیوں تعجب ہو؟ ممکن ہے کہ سرمد کے بے جان سر سے آواز نکلی مگر اربابِ بصیرت نے اسکی زبانِ حال کو تو ضرور متکلم دیکھا ہوگا اور ڈھائی سو برس سے زیادہ گزر گئے ہمارے کانوں میں تو اب تک شہید سرمد سے صدا آرہی ہے کہ

کس چہ داند قدر مُردن ہائے عشق
منت ایں مرگ بر جان من است

عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور تین سال کے بعد سرمد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ایک قرن سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ

خونے کہ عشق ریزد ہرگز ہدر نباشد

یہ سرمد کے خون ہی کی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالمگیر کو کبھی راحت و اطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ پیغامِ اجل بھی آیا تو عالمِ غربت و پریشانی میں۔ مگر سوانح نویس کے قلم سے ایسے جملے نہیں نکل سکتے۔ ہمارے لئے تو یہی بہتر

ہے کہ ہو سکے تو عالمگیر کو بھی اس معاملہ میں معذور سمجھیں۔ تاریخ۔ قیاس و ظنون اور شخصی آرا کے مجموعہ کا نام ہے۔ آج چند میلوں کے فاصلہ پر ایک حادثہ گزرتا ہے تو اخباروں کے دو نامہ نگار متفق البیان نہیں ہوتے۔ کس کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی اور عالمگیر کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا؟ پھر یہ بھی ہے کہ خون رفتگان عشق جب اپنے قاتلوں سے گلہ مند جفا نہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ اُن کی شکایت سے قلم آلودہ ہوں۔ جب سرمدؔ نے جلاد سے کہا کہ "تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم" تو اسے عالمگیر اور عالمگیری علماء سے کیا شکایت ہو گی؟ بات یہ ہے کہ دیار محبت میں انتقام و دعوے کی شنوائی نہیں اور عشق کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لے کر آئے تو سر جھکا دیجئے اور ہو سکے تو اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجیے۔

شد سرت سینۂ ظہوری پُر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

سرمد کے کلام کا ایک صحیح اور قلمی نسخہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے مگر اس وقت پیش نظر نہیں۔ چند سطروں کا ارادہ تھا مگر کئی صفحے ہو گئے اور عشق کی حکایت کب ختم ہونے والی ہے۔ اس لئے چاہتا کہ روح سرمد پر دست فاتحہ اُٹھا کر خاموش ہو جاؤں۔ آئندہ کبھی موقع ملا تو سرمد کا کلام پیش کروں گا۔ افسوس ہے کہ یہ داستان مختصر نہ ہو سکی۔ مگر شہیدانِ محبت کی یاد میں جتنی دیر افسردہ رہ سکیے بہتر ہے

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسےٰ اندر طور

تنویر پریس لکھنؤ

افسوس! چونکہ آزاد مرحوم پر غایت از

ہندویت کا ہو چکا تھا۔ اسلئے اِس طرح کا مقام

در تردید اورنگ زیب لیکن در پردہ تردید

شریعت لکھ مارا۔ چونکہ خود اُن کا مسلک

اِسی انداز کا تھا۔

شائع کردہ :۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تنویر پبلشرز۔ لکھنؤ
مطبوعہ :۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تنویر پریس۔ لکھنؤ
قیمت :۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چھ آنے

کتابت و طباعت زیر اہتمام
دانش محل۔ امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ

Azad, Abul Kalam, maulana
Ḥayāt-i Sarmad